اِک کتھا انوکھی
وزیر آغا

اک کتھا انوکھی

وزیر آغا

مکتبہ فکر و خیال لاہور

ضابطہ

حقوق ـــــــــ بحقِ مصنّف محفوظ

طبع ـــــــــ اوّل

ناشر ـــــــــ بذلِ ندیم

خطّاطی ـــــــــ محمد ارشد ہاشمی

سرورق ـــــــــ مُوجد

مطبع ـــــــــ آصف اقبال پرنٹرز لاہور

ماہ و سالِ اشاعت ـ اگست ۱۹۹۰ء

قیمت ـــــــــ چالیس ۴۰ روپے

مکتبہ فکر و خیال ۱۷۲ ستلج بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

قیوّم نظر کی یادیں ـــــ

اُس کی آواز میں تھے سارے خدوخال اُس کے
وہ چہکتا تھا تو ہنستے تھے پرَوبال اُس کے

غزلیں

اک کتھا انوکھی

سفر سے مفر نہیں ہے۔ اکثر لوگ یا تو دائرے کی کھائیوں میں سفر کرتے
ہیں یا پھر خطِ مستقیم پر رواں دواں نظر آتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں
جنہوں نے بیک وقت کئی اطراف میں سفر کیا ہے — دائرے میں سفر کرتے
ہوئے انہیں محسوس ہوا کہ انجام اور آغاز کا کوئی وجود نہیں ہے، علت اور
معلول کی حیثیت ثانوی ہے۔ وقت کا ہر نقطہ بیک وقت آغاز بھی ہے
اور انجام بھی — خطِ مستقیم پر سفر کرتے ہوئے انہیں محسوس ہوا کہ کوئی بھی
عمل آغاز اور انجام سے بے نیاز نہیں، زندگی میں کہیں بھی تکرار نہیں ہے۔
قدم قدم پر منظر نامہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ خطِ مستقیم کو اختیار نہ کیا جائے
تو زندگی کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں گھومتے گھومتے ایک
روز تھک ہار کر رُک جاتی ہے — مگر، جیسا کہ میں نے کہا، اس چند گام
مرحلۂ حیات میں کچھ اور طرح کے سفر بھی ہیں۔ مثلاً تہ در تہ سفر جو محض ایک
دائرے کا سفر نہیں بلکہ ایک ایسے چکر دار (SPIRAL) کا سفر ہے جو
دائرہ در دائرہ باہر کی طرف بھی پھیلتا ہے اور اندر کی طرف بھی! تالاب

میں کنکر پھینکنے سے ہر دم وسیع سے وسیع تر دائروں کا جو منظر ابھرتا ہے وہ اسی سفر سے مشابہ ہے بشرطیکہ ہم اس کے ساتھ دائرہ در دائرہ سمٹنے کا منظر بھی منسلک کر لیں ___ پھر ایک سفر عمودی نوعیت کا بھی ہے جو دائرے یا خطِ مستقیم کے سفر سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ سفر کائنات اور ذات میں، موجود اور وجود میں، جسم اور روح میں حائل فاصلوں کو عبور کرتا ہے۔ بظاہر یہ اور اسی وضع کے کچھ اور سفر محض چند گام کے ہیں مگر ساری عمر بھی چلتے رہیں تو یہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ تخلیقِ شعر کا عمل بھی مزاجاً ایک ایسا ہی سفر ہے جو دائرے یا خطِ مستقیم کے بجائے بعض پُر اسرار ابعاد کے اندر طے ہوتا ہے۔ اسی لیے ہر شعری مہم ایک انوکھی کتھا ہے ___ اگر وہ انوکھی نہ ہو تو پھر وہ شعری مُہم نہیں، کوئی اور شے ہے۔ ہر نظم بلکہ ہر شعر کی تخلیق ایک نئے دیار میں پا پیادہ سفر کرنے کا نام ہے اور مَیں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے عمر بھر اس سفر میں مبتلا رہنے کا موقعہ ملا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ اسی سفر کی ایک صدی، ایک سال یا ایک لمحے کی کہانی ہے۔ اگر قاری میرا ہم سفر بن کر، اس انوکھی کتھا کو میرے ساتھ سننے پر مائل ہو جائے تو مَیں اسے اپنے لیے ایک بہت بڑی سعادت سمجھوں گا۔

وزیر آغا

سرگودہا ۱۴راگست ۱۹۹۰ء

طویل نظم

جا بھی چکے تھے اور رُک کے بھی کھڑے تھے ہم
اپنے سے دُور جا کے بھی ہم اپنے پاس تھے

تمام عُمر پھرے کاسۂ بدن لے کر
کہ جیسے اپنے ہی دستِ گدا میں تھے ہم بھی

اک کتھا انوکھی

اک جنگل تھا
گھنی گھنیری جھاڑیوں والا
بہت پرانا جنگل
جس کے اندر
اک کُٹیا میں
اپنے بدن کی چھال میں لپٹا
اپنی کھال کے اندر گم صُم
جانے کب سے
کتنے جگوں کے
پھٹے پُرانے چوغے پہنے
وہ اک خستہ بیج کی صورت
بے سُدھ
بے آواز پڑا تھا !

بادل آتے
کڑک گرج کر اُسے بلاتے
بن برسے ہی پچھم کی جانب مڑ جاتے
ہَوا دہکتی آنکھیں
ٹھنڈی پوریں لے کر
اس کے چاروں جانب پھرتی
پر کیا کرتی
گیدڑ، مور، ہرن اور بندر
سب کُٹیا کے باہر ملتے
سبھا جماتے
اس سے کہتے :
"اب تو اٹھ جا
آخری جُگ بھی بیت چکا
سُورج میں کالک اُگ آئی
چاند کا ہالہ ٹُوٹ گیا
دیکھ کہ گھاس جلی جُھلسی ہے
ندیوں میں جل سُوکھ گیا
جس بھی سنہری بیج سے
یہ برہمانڈ اُگا تھا

واپس شاید اسی کے اندر
اُتر گیا!"
لیکن وہ کُٹیا کے اندر
اپنے بدن کی چھال میں لپٹا
بند پڑا ہے
یوں لگتا ہے جیسے اب وہ
اپنی شکتی کھو بیٹھا ہے
یا پھر باہر آنے سے
وہ ڈرا ہوا ہے
اور برہمانڈ کے
آگ آنے کو
بہت بڑا اک پاپ سمجھتا ہے!

پاپ اور پُن کی کتھا پُرانی
کون اس کو سمجھائے
نازک تتلی رس چوُسے
اور بھونرا شور مچائے
رشتے
بانکی موجوں ایسے

پلک جھپک کر آئیں
پل بھر رُک کر
گرہ بنائیں
پھر ساحل کی سِل پر
گِر کر
کرچ کرچ ہو جائیں !

سُن کر میری بات کٹیلی
اُس کے لب پر
جاگ اُٹھی مُسکان رسیلی
بوجھل پلکوں کی درزوں سے
جھانکا
اُس کے من کا اُجالا
اُس نے جیسے
کروٹ لی ہے
اور پُوچھا ہے :
کہاں ہوا ہیں ؟ کیا سمے ہوا ہے ؟ !
اس بے انت گھنیری بوجھل نیند سے پہلے
رانجھن، سوہنی ، مرزا ، رادھا ، پنّوں ـــ سارے

شبنم کے نمناک ستارے
ان میں سے بھی کوئی بچا ہے؟
کوئی بچا ہے؟؟

کون بچا ہے!
آنسو پی کر
رُندھی ہوئی آواز میں اُس سے
مَیں کہتا ہوں:
تُو کس جُگ میں رُکا کھڑا ہے
آنکھیں کھول کے باہر آ
اور دیکھ کہ گلیاں سب
اُجڑی ہیں
گلشن بے آباد ہیں سارے
ریت کے دھارے!
ریت کے دھارے، تیل کے دھارے بن کر
اُبل پڑے ہیں
لوہا جیسے جاگ اُٹھا ہے
چہک رہا ہے
چاروں جانب کُوک رہا ہے
تتلی، بھونرا، کوئل، چڑیا

——— سب لوہا ہے
لوہے کے پَر اُگ آئے ہیں !

وہ کہتا ہے :
یہ سب کیسے ہوا ہے بھائی ؟
مَیں جب سویا
ہر شے جاگ رہی تھی
پھُولوں میں رس
ندیوں میں چاندی بہتی تھی
دریاؤں کے پاٹ کشادہ
پیڑوں پر پھل پھُول لگے تھے
گائے گابھن، اگری لبالب
نار کی گود ہری تھی
راجہ خوش تھا، پرجا خوش تھی
دھرتی جیسے کنول کی صورت کھلی ہوئی تھی !

مَیں کہتا ہوں :
وہ ست جُگ تھا سونے والے !
یہ کلجگ ہے
کلجگ ——— جو سرطان کی صورت

پھیل چکا ہے

دُھواں اُگلتے، آہیں بھرتے

بوڑھی، بانجھ ملوں کے پنجر

کھمبوں کی صورت

دھرتی کے اندر سے جیسے اُگ آتے ہیں

جن کے زہر کو ہم

فصلوں پر

اور بچّوں پر

روز چھڑکتے ہیں

بِس کی پُڑیاں

گیس کے گولے

ڈالر، ایڈز، پلاسٹک، پھوڑے

ان میں بانٹ رہے ہیں

دھویں کے کاجل سے

بچّوں کی

ننھی مُنّی سندر آنکھیں "روشن" کر کے

سیب ایسے ان کے گالوں پر

زہریلا، مٹیالا پاؤڈر مل کر

ہم کہتے ہیں :

آہا! کیسا نکل آیا ہے چاند سا مکھڑا
کیسا پیارا پھول کھلا ہے!!

چُپ ہو جاؤ!
پھٹ کر اُس کا اندر جیسے چیخ اُٹھا ہے
رُک جاؤ
وہ چڑ مڑ ہو کر
منّت کر کے
پوچھ رہا ہے:
یہ سب کیسے ہوا ہے بھائی!
میں جب سویا ——

میں کہتا ہوں:
نیند کے ماتے!
تُو جب سویا
ہر شے جاگ رہی تھی
صدیوں تک
بیدار رہی تھی
پھر اک دن

آکاش سے اک دُم دار ستارہ
آنسو کا اک بھاری پربت
اس دھرتی پر آن گرا تھا
دھرتی جننا بھُول گئی تھی
لوہا، سر پر اک فولادی تاج رکھے
اس دھرتی کا سرتاج ہوا تھا
وہ دن اور پھر آج کا دن
اس دھرتی پر نہ رات آئی
نہ دن نکلا
نہ شام ہوئی ہے
ایک مسلسل آندھی
بے آرام ہوئی ہے
وقت نے اُٹھ کر
اک اندھی رفتار سے خود کو
لیس کیا ہے
بجلی کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھا ہے!

سونے والے!
تُو جب خود کو اوڑھ کے سویا

کانوں کے پَٹ
اندر کی جانب کُھلتے تھے
کومل، میٹھی آوازیں تب
اندر سے دستک دیتی تھیں
اندر — جو پریوں کا مسکن
آٹسس، شمس، زیوس، شیوا — سب کی
آوازوں کا ایک نگر تھا
خود "باہر" بھی
جس "اندر" کا
اک حصّہ تھا!

سونے والے!
تو گُم صُم، بیہوش پڑا تھا
اور ہم روگی جاگ رہے تھے
یک دَم
ایک پہاڑ پھٹا تھا
پنڈورا کا قفل کُھلا تھا
اور بلائیں
چیخوں کی صورت نکلی تھیں

کومل، میٹھی آوازوں پر جھپٹ پڑی تھیں
بم، راکٹ، جٹ جمبو، باجے، بھڑک اُٹھے تھے
تُند ہَوا کی چیختی شُوکر
پھیل گئی تھی
کانوں کی نابینا آنکھیں
باہر پر مرکوز ہوئی تھیں
"باہر" اور "اندر" میں اک
دیوار کھنچی تھی
تیز نکیلی آوازوں کی
فصل اُگی تھی!

فصل اُگی تھی؟؟
مجھے بتا
اس بے سمتی
اس ہاہاکار میں
چیخوں کی اندھی برکھا
اور چُپ کی
تہ در تہ سلوٹ میں
انسانوں پر کیا بیتی ہے؟

کس نے ان کی رکھشا کی ہے ؟

سونے والے !
جب دھرتی پر آوازوں کا شور اُٹھا تھا
اور فولاد کا راج ہوا تھا
انساں سارے
لوہے کے رو بوٹ بنے تھے
بے چہرہ ، بے نام ہوئے تھے
کالے پیلے ہندسے بن کر
لفظوں کے آنکھوں پر جیسے ٹوٹ پڑے تھے
اک اک "لفظ" پہ ثبت ہوئے تھے

اور اب
ہندسے ہی ہندسے ہیں
جمع کرو ــــــ تو دُگنے تگنے ہو جاتے ہیں
لاکھوں کا اک لشکر بن کر
آگ اور خون کے کھیل کا منظر
دکھلاتے ہیں
ضرب لگے تو
بھنور سا بن کر تیز ہَوا کا ،

پاگل بھوتوں کے
وحشی گرداب کی صورت
ایک ہی پَل میں
دھرتی اور آکاش سے اُونچے اُٹھ جاتے ہیں
کرو اگر تفریق —— صفر ہو جاتے ہیں !

تُو کہتا ہے :
چُپ کی تہ در تہ سلوٹ میں
انسانوں پر کیا بیتی ہے
کس نے ان کی رکھشا کی ہے ؟
مَیں کہتا ہوں :
ان کو رکھشا کی حاجت ہی کیا ہے
یہ سب
نسلی پاگل پن کی رکھشا میں ہیں !
ساگر جس نے
ان کیڑوں کو جنم دیا تھا
اب اک گندا جوہڑ بن کر
ان کے اندر کے جوہڑ سے
آن ملا ہے

ساگر کا اُپمان ہوا ہے
ساگر ماں ہے
ماں ہتھیا
اس کلجگ کا اپمان ہوا ہے !

اور اب ـــــ یہ سب
گندے کیڑے
جنگل پر بھی جھپٹ پڑے ہیں
جنگل جس نے کتنا ان سے
پیار کیا تھا
ان کی کتنی نسلوں کو پالا پوسا
آباد کیا تھا
اب یہ اس جنگل کو
اپنے ساتھ ستی ہو جانے پر
مجبور کریں تو بول
یہ کیسا انیائے ہے !
جنگل جنگل آگ لگی ہے
اور یہ مُورکھ
لُو کے تھامے
جگمگ جگمگ ناچ رہے ہیں

گیدڑ، مور، ہرن اور بندر
رو رو کر ہلکان ہوئے ہیں
اندر
ماس کے جلنے کی بدبُو پھیلی ہے
باہر
نیزہ پھن پھیلائے جھوم رہا ہے

اور جنگل کے پنچھی سارے
آگ کے جلتے بجھتے اکھّر
دُور ـــــ آکاش کی جانب اُڑ کر
چاند اور سورج کے کنگروں پر
جا بیٹھے ہیں
وہاں سے بُھر کر
حرفوں کے ریزوں کی صورت
دھرتی کے آنگن میں جیسے
آن گرے ہیں
اک منحوس عبارت بن کر
ہم پُرشوں کے ماتھوں پر
مرقوم ہوئے ہیں

اور ہم
جو اب پُرش نہیں ہیں
اپنی اپنی قبروں پر ہم
نصب ہوئے ہیں
ہم جو اڑتی کالک اور
آواز کے چاک سے اترے ہوئے
کوزوں کے نقش ہیں
اپنے آپ کی پرچھائیاں ہیں
دھڑ دھڑ جلتے جنگل میں ہم
ننگے پیروں چلتے
اپنے آپ کا اک مدھم سا عکس
ہَوا کا لمس بنے ہیں
ہم اب راکھ ہیں اور
ہم سب نے
اپنی راکھ کو
اپنے ہی تاریک مُکھوں پر
تھوپ لیا ہے
آنسو کی بے نام نمی سے
اپنی پیاسی "پیاس" کو بے زنجیر کیا ہے!

سونے والے!
تجھ کو شاید خبر نہیں ہے
برسوں پہلے
تیری اس کُٹیا سے دُور
پہاڑ کی اوٹ میں اک قصبہ تھا
اُس قصبے میں
ناؔمی نام کی ایک سہاگن
سدا سہاگن
جانے کب سے
اپنی ہی خوشبو کے اندر
بسی ہوئی تھی
سب کہتے ہیں
اک دن ایسا بھی آیا تھا
اُس خاموش ابھاگن کا اکلوتا بیٹا
جھیل کنارے گیا
مگر لوٹا ہی نہیں تھا
اور وہ عورت
ایک ہی شب میں
کالی بن کر بھڑک اُٹھی تھی

"ماں پُترو ! ماں پُترو[1] !" کہتی
قصبے کی گلیوں میں
ساری رات بھٹکتی پھرتی تھی
بند کواڑوں پر
دو ہتّڑ مار کے روتی
چیخوں سے حملے کرتی تھی
اور گلیوں میں
جو بچّہ بھی اُس کو ملتا
وہ خُونی پنجوں سے اس کی
بوٹی بوٹی کر دیتی تھی
پھر ندّی پر جاکر اُس کو
کھا جاتی تھی !

تجھ کو شاید خبر نہیں ہے
ماں پُترو ! ماں پُترو ! — کی مانوس صدا
بازاروں اور گلیوں سے نکل کر
کھیتوں، ٹُنڈ مُنڈ پیڑوں

---

[1] "میاں پوترو" — کشمیری زبان کا لفظ بمعنی "میرے بیٹے !"

سُوکھے اور سنسان پہاڑوں
صحراؤں، دریاؤں اور جنگلوں میں پھیل چکی ہے
لچ لچ کرتے شپّرک بن کر
ایک اک شاخ سے جھُول گئی ہے
ایک اک ہونٹ سے
پھُوٹ رہی ہے
تجھ کو شاید خبر نہیں ہے
خود دھرتی بھی
اک شپّرک ہے
نامی نام کی اک ناری ہے
ماں پُترو! ماں پُترو! —— کہتی
سُورج کی گلیوں میں
چیخیں مار رہی ہے
جُھکے ہوئے آکاش کی
کُنڈ کنگڑی[1] کے اندر
جھانک رہی ہے!

سونے والے!

---

[1] کانگڑی (کشمیر کے لوگ آگ تاپنے کے لیے استعمال کرتے ہیں)

تُو ــــ کُٹیا کا چھلکا اوڑھے
بیج کی صورت
بند پڑا ہے
اور ہم تیری کھوج میں
نامی نام ہوئے ہیں
کتنے بے آرام ہوئے ہیں
جب سے ہم
"اندر" سے کٹ کر
"باہر" میں آباد ہوئے ہیں
بھاری بوجھل آوازوں کے
قدموں میں پامال ہوئے ہیں
اور ہماری آنکھیں جب سے
اگنی وِش
کی برکھا سے دوچار ہوئی ہیں
آتش بازی کے منظر کا حصّہ بن کر
خود بھی آتش بار ہوئی ہیں
اندر والے دیپ کی
بھیگی خوشبو سے ناراض ہوئی ہیں!

نیند کے ماتے !

دیکھ ! ـــــــ وہ سندر دھوپ

وہ اُودی شال

جسے ہم اوڑھ کے روز پھرا کرتے تھے

دھوپ کہ جس کے لمس میں

ماں کے نرم گداز لبوں کی شیرینی تھی

جس کے سانس میں

مرغابی کے پَر کی گرمی

کچّی نرم سگندھ کلی کی

رچی بسی تھی

وہ ناری

اب آتش پیکر

آتش کا پرکالہ ہے

اک چنگاری ہے

بھڑک اٹھی ہے

آنکھوں کے غرفوں سے ہم کو

گھُور رہی ہے

ہونٹوں کی محراب سے لُو کے

پھینک رہی ہے !

سونے والے !

اب تو اُٹھ جا

دیکھ کہ آگ گھنے جنگل کی

آتش ناک بھجنگ کی صورت

شُوک رہی ہے

اور ہوا

بدمست ہوئی ہے

تجھ کو شاید خبر نہیں ہے

پہلے بھی اک ایسا ہی

طُوفان آیا تھا

تب اک بیج کی کشتی میں تُو

پانی کی شکنوں پر چلتا

ایک پہاڑ پہ جا پہنچا تھا

ایک نیا انکھوا

پھُوٹا تھا

ایک نیا سُورج نکلا تھا !

آج وہی طوفان

نئے انداز میں ہم پر ٹوٹ پڑا ہے

لیکن اب کی بار یہ طوفاں
اگنی کا ہے
جلے ہوئے کیسر کے ڈنٹھل
شعلوں کے گرداب
ہوا کا شور
گھنے بادل کے تن پر
دھڑ دھڑ پڑتے
آگ کے دُرّے
ایک عجب کہرام بپا ہے
تُو ـــــ اپنی کُٹیا کے اندر
بند پڑا ہے
سونے والے !
باہر آ
اور امرت رس سے بھرا ہُوا
مہتاب کا کاسہ
سُورج کے ہاتھوں سے لے کر پی
کہ تیری آنکھ سے پھر

کرنوں کا سونا

چشمہ بن کر پھوٹ بہے

اس میرے جگ کو

نئے جنم کی ملے بشارت

میرے مورکھ دل کو بھی آنند ملے

میری آنکھ بھی

کشتی کا بہروپ بھرے

پال اُڑا کر

نورانی موجوں پر سفر کرے

بجھے ہوئے اِس میرے قلم کی

نوک پہ بھی اک

پربت جتنے

شبنم ایسے

لفظ کا دیپ جلے !!

اک "لفظ" کا دیپ جلے !!

نظمیں

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عُمر ہی چلنا پڑا تجھے

کچے گھڑے کی ناؤ میں کرتے رہے سفر
کیسے عجیب لوگ تھے دریا کے پار کے

دیوارِ گریہ!

عجب جادو بھری آنکھیں تھیں اُس کی
وہ جب پلکیں اٹھا کر اک نظر تکتی
تو آنکھوں کی سیہ جھیلوں میں
جیسے مچھلیوں کو آگ لگ جاتی
ہزاروں سُرخ ڈورے تِلملا کر جست بھرتے
آبِ گُم کی قید سے باہر نکلنے کے لیے
سو سو جتن کرتے
مگر مجبور تھے
چاروں طرف آنسو کے گنبد تھے
نمی کے بُلبُلے تھے
اور اک دیوارِ گریہ
جو ازل سے تا ابد پھیلی ہوئی تھی!

عجب جادو بھری آنکھیں تھیں اُس کی
بظاہر آنے والوں کو "نہ آنے" کے لیے کہتی
بباطن چاہتی دیوار کو وہ توڑ کر اُس تک پہنچ جائیں!

کھڑا ہوں مَیں پسِ دیوارِ گریہ
نمی کے بُلبلوں کو اُس کی پلکوں پر لرزتے، جھلملاتے
دیکھتا ہوں، اُنگلیوں سے چھُو بھی سکتا ہوں
مگر دیوارِ گریہ کو
اُفق سے تا اُفق پھیلی ہوئی
شیشے کی اس شفّاف چادر کو
کبھی، اب تک تو کوئی توڑ کر آگے نہیں آیا
مَیں اک آنسو بھرے لمحے کی سلوٹ
مَیں کیسے پار کر سکتا ہوں اس کو!!

——— ———

انگیٹھی !

بدن اُس کا
ہزاروں سُرخ پھُولوں سے فروزاں تھا
تمازت اور خوشبو ——— دو۲ جواں سکھیاں
اُسے سرگوشیوں میں چھیڑتی تھیں
خوشی کی آنے والی ساعتِ نایاب سے
اس کو ڈراتی تھیں
اُسے، برفاب سپنوں کے پگھلنے کا
عجب منظر دکھاتی تھیں !

اور اب چاروں طرف
یخ بستگی ہے
بکھرتی راکھ نے سب سُرخ پھُولوں کو بُجھایا ہے
تمازت اور خوشبو

دَم بخود ہیں
سیاہی، قطرہ قطرہ
نرم بادل کی سیہ تہ سے ٹپک کر
بیاضِ ارض کو گدلا رہی ہے
کواڑوں کی بچی دراڑوں سے
ٹھنڈی یخ ہوا کمرے کے اندر آ رہی ہے
سُلگتے کوئلوں کو کھا رہی ہے !!

چرنوبل!

خود اپنے تن کی گرمی سے پگھلنا
موم ہو جانا
عناناؔ کا خود اپنی کوکھ کے اندر اُتر جانا
سفیدی اور سیاہی کا چمکنا
ایک ہو جانا
زمیں کے بازوؤں میں جھولنا
مستی سی بن کر
چار سُو اُڑنا
محبّت کے سندیسے بھیجنا
سینے سے چمٹانا
یہی اُس کا تھا افسانہ!

اور اب اُس کا پگھلنا

ـــــــــــــــــ

INNANA ـہ

اک قیامت ہے

زمیں کی کوکھ میں ہیجان ہے

آکاش ——— اک تانبے کا خیمہ ہے

ہَوا نے بھر لیا ہے، اپنا نافہ

اُس کے جلتے جسم کی بُو سے

ہَوا اب چوکڑی بھرنے کو ہے

اُڑنے کو ہے ——— پاگل ہَوا

اب سبز کھیتوں، ناچتے شہروں میں جائے گی

پھلوں، پھولوں، چہکتی کونپلوں کو چھُو کے گزرے گی

بدن کی خاک میں اُترے گی اور بیمار نسلوں

خون کے پیاسے سیہ کانٹوں کی صورت

اُگ پڑے گی

سُرمئی ناگوں کی صورت

پھیل جائے گی !

ہَوا اب مُشک بُو ہے

قہر ہے

یہ خوب رو پاگل ہَوا

اب زہر ہے !!

وہ کیا ہے؟

وہ کیا ہے
جس کی خاطر میں پہاڑوں، ریگ زاروں
بند گلیوں
تنگ، گُبڑی گھاٹیوں میں گھومتا ہوں؟
لہو بن کر
بدن میں دوڑتا ہوں
کبھی سرکش ہَوا کی موج ہوں مَیں
کبھی لاوے کی صورت رینگتا ہوں
وہ کیا ہے جس کی صورت سے بھی مَیں واقف نہیں ہوں
جسے مَیں نے کبھی دیکھا نہیں ہے
مگر جو ہر جگہ ہے
ہر بُنِ مُو سے اُگی ہے
کرن کی قوس میں

چُپ کی چُبھن ہیں
سانپ کی پُتلی ہیں
اور سورج مُکھی کی آنکھ ہیں موجود ہے
جو رات کے پچھلے پہر شبنم ہیں ڈھلتی ہے
سحر دم اک عجب چہکار بنتی ہے
کبھی جب شام کی ڈولی
تھکے ہارے ہوئے بادل کے شانوں سے اُترتی ہے
تو میری تشنہ لب آنکھوں کو
اک ٹھنڈا ستارہ بن کے ڈستی ہے
تمہاری راہ تکتی ہے !

خاک کا رزق تھا وہ

پَو پھٹی
رات نے گھبرا کے کہا :
مَیں تو برباد ہوئی
میرا خیمہ ، میری چادر ، میری توقیر گئی
مَیں تو تاراج ہوئی !

دُور
اک بانسری
اک شہد کی پیاسی مکھّی
رس بھرے ہونٹوں سے
امرت بھرے پھُولوں کے کناروں سے اُڑی
اور بولی :
مَیں تو سرشار ہوئی

گنگناتی ہوئی آواز بنی
رقص کرتی ہوئی رفتار ہوئی !

اور وہ شخص
خُنک نیند، دہکتی ہوئی بیداری کے
(دُھوپ اور سائے کے)
موہوم سے سنگم پہ کہیں
سبز صدیوں سے لبالب بھرے
ساگر کے کنارے پر رُکا
اک لرزتا ہُوا شفّاف سا
آنسو بن کر
اپنی پلکوں سے گرا
خاک کا رزق تھا وہ
خاک ہُوا !!

اک ڈری ہوئی آواز

رات کو جب تاروں کی آنکھیں
گھورنے لگتیں
اور شب کے ناراض پرندے
تیز کٹیلے خنجر ایسے پنجے لے کر
ہر سُو اُڑتے
گہرے جنگل کے اندر سے
لال انگارہ بھوکی نظریں
باڑے پر مرکوز دکھائی دینے لگتیں
تو ـــــ ایسے میں
مَیں، اپنے بستر میں دبکا
اک بھاری کمبل میں لپٹا
آنکھیں میچے
آنے والی سبز رُتوں کے منظر تکتا

اپنی آنکھ کے ٹھہرے موسم میں خوش رہتا
پر شب کی برفیلی، خُونی، گھُورتی آنکھیں
گھنی گھنیری باڑ کو تنکا تنکا کر کے
ٹھہری آنکھ کے باڑے کے اندر آجاتیں
ممیاتی خوشیوں کو ہانک کے لے جاتیں
جنگل کے گہرے سایوں میں
آوازوں کے قتل کا منظر کو دیتا
پھر بجھ جاتا
پھر سنّاٹا
پھر باڑے میں
اک ڈری ہوئی آواز
اکیلی ـــــ ممیاتی آواز !!

سنّاٹا

سنّاٹا ــــ اک چیز عجب ہے!
ننھی مُنّی ، دانہ دُنکا چُگتی آوازوں کا
بہت پرُانا دشمن ہے!

سنّاٹا ، اک چیز عجب ہے
پت جھڑ کی پھیلی چادر پر
پھول ایسے قدموں کی آہٹ
چھوٹے سے اک کنکر کے گرنے پر
نیلی جھیل سے قازوں کی پرواز
چھنکتی چاندی کی پازیب سے ٹوٹی
اک پیاسی چہکار
سبھی شرمیلی، ڈرتی چھن چھن اُڑتی
آوازوں کا

سناٹا ــــ اک بہت پرانا دشمن ہے !

سناٹا، اک چیز عجب ہے
چڑیوں کی آوازوں کا جب بھوجن کرکے
پھُولے پیٹ کو سہلاتا ہے
اور پھر
گہری بوجھل نیند میں کھو جاتا ہے
تو اس کے خرّاٹوں کی آواز
اُچھلتی، بل کھاتی
اک موج ہَوا کی بن جاتی ہے
سناٹے کے سیلِ رواں کی
اپنی اک بھاری آواز اُبھر آتی ہے !!

کہاں گئی ہو!

کہاں گئی ہو؟
فلک کے اُس پار جا بسی ہو؟
زمیں کی گہری گپھا کے اندر اُتر گئی ہو
کہاں گئی ہو؟

تمہارے ہونے سے دل جواں
رہگزر رواں تھی
گلاب چہروں سے ساری بستی مہک اٹھی تھی
خوشی، مکانوں کے ساغروں سے چھلک پڑی تھی
تمہارے جانے کے بعد
اب کچھ رہا نہیں ہے
اُداس شاخوں میں
اک بھی بھیگی صدا نہیں ہے

ہَوا سے خوشبو
زمیں سے برکھا خفا کھڑی ہے !

کہاں گئی ہو ؟
رسیلی ، میٹھی ، گداز ـــــ گھی میں گُندھی رُتو
تم کہاں گئی ہو ؟ ؟

اگر آج تم ——!

اگر آج پھر دن ڈھلے تم
پہن کر وہی اپنا پہلا سجیلا بدن
آگئی ہو
مجھے پھر کسی سر پھری موج کے رُوپ میں
کف اُڑاتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہو
تو آؤ —— قریب آ کے دیکھو
کہ مَیں تو ہزاروں برس سے
شب و روز ساحل کی جانب
تمہاری ہی جانب
اُمنڈتا رہا ہوں
کبھی مَیں نے سوچا نہیں تھا
کہ اک روز جب مَیں چٹانوں کے قدموں میں
ساحل کی بھیگی ہوئی ریت پر آ کے بچھنے لگوں گا
تمہارے قدم چھُو سکوں گا

تمہیں ــــ اس جگہ، ان چٹانوں کے نیچے
بچھی ریت پر
اک نہ اک دن تو آنا تھا
سو آگئی ہو
مجھے اس جگہ روز آنے کی عادت ہے ــــ میں
اپنی عادت سے مجبور ہوں
آگیا ہوں
مگر مجھ میں اور تم میں
رشتے کی وہ ریشمیں ڈور سی
اب کہاں ہے ؟
زمانہ ــــ کماں سے نکلتا ہوا تیر تھا
جا چکا ہے
میں اک خستہ تن موج ہوں
ٹوٹ جانے کو ہوں
اور تم
سچ بتاؤ، تمہیں اب یہاں سے کہاں
کس طرف کُوچ کرنا ہے ؟؟

ہَوا سے کہنا !

ہَوا سے کہنا
خدا را اتنی نہ تیز آئے
کہ سبز پتّے
لچکتی شاخوں سے ٹُوٹ کر گر پڑیں
زمیں پر
ہَوا سے کہنا !

ہَوا کے جبر کے
نجانے کب سے مَیں سہہ رہا ہوں
مگر یہ جبر کا تو سارے جبروں سے سخت تر ہے
کہ سبز پیڑوں سے چادریں بھی اُتار لے وہ
تمام گہنے بھی چھین لے وہ
برہنگی کا عذاب نازل کرے زمیں پر

زمیں کے معصوم باسیوں پر

برہنگی سے نہیں ہے بڑھ کر عذاب کوئی
ہوا سے کہنا !

ہوا سے کہنا
خدا را اتنی نہ تیز آئے !!

عذاب !

ہَوا ـــــ ابھی چلی نہیں
ابھی نگر کے سارے پیڑ چُپ کھڑے ہیں
دَم بخود ہے ان کے پاؤں میں زمیں
فضا میں دُور دُور تک کوئی پرند بھی نہیں
کہاں گئے وہ سبز طشت گھاس کے، کہاں گئے
وہ موتیے کے پھُول چاند رات کے
کدھر گئے وہ نیل سر، وہ دُودھ جھیل
خواب کی ؟

دہکتا سُرخ کوئلہ سا آفتاب
دھوئیں کے زہر میں بجھے
ہزار تیر پھینکتا
بدن کی ساری پسلیوں کو توڑتا، ہَوا کی

نالیوں کو بند کر کے جھومتا

کراہتی زمین پر
عذاب بن کے ٹوٹتا

دہکتا سُرخ کوئلہ ـــــ اُتر چکا ہے
تن کی پور پور میں
اُتر رہا ہے روح کے غبار میں

مَیں کیا کروں ؟
کہاں چھُپوں ؟
تمام پیڑ بے لباس
تمام سائباں پھٹے
کہو نہیں کہ شام اب قریب ہے
کہ شام خود بھی آگ ہے
سگار کی سفید نرم راکھ میں ـــــــــ

ـــــــــــــــ

موت!

ٹھنڈا، کڑوا ــــ کرب
جو میری اک اک رگ میں
آتش خیز مواد کی صوُرت چھُپا پڑا تھا
آگ کے بھیگے لمس کا طالب
پنبہ پنبہ، تنکا تنکا، جمع ہوا تھا
آج کہیں سے اُڑتا ہوا اک تُند شرارہ
اس کے تنکوں کو تاراج
گھروں اور طاقوں کو کافور کیے
اک سانپ کی صورت شوُک رہا ہے
مجھ کو خس کا اک جلتا انبار بنا کر
ننھّے مُنّے پھُولوں کی بھیگی آنکھوں کو
راکھ بنانے آپہنچا ہے!

کرب کی بھی تو آخر کوئی صورت ہو گی
اُبلی آنکھیں، گندے لانبے دانت، اُدھڑتی کھال
نکیلے ناخن،
پر یہ کیسا کرب ہے جس کے
چہرے پر کوئی نقش نہیں ہے
کیسا زہر ہے جس کا کوئی نام نہیں ہے ؟؟

صحرا کی بارش!

کہاں ہے وہ بادل؟
پرندے کہاں ہیں؟
کہاں ہیں وہ صحرا کے سینے سے
دَم بھر میں
باہر کی جانب اُڑتے، لپکتے ہوئے
سُرخ پھُولوں کے کوندے؟
جو ندّی کے ویراں کناروں کی
بے آب درزوں میں
سوئے پڑے تھے
کہاں ہے وہ برکھا
کہ جس نے ہتھیلی کی ریکھا کو
خوشبو بھرے دُودھ سے بھر دیا تھا؟
کہاں ہے وہ ندّی

کہ جس نے مجھے

اپنے بنجر کناروں پہ اُگنے، ہمکنے دیا تھا ؟

مجھے ایک پَل کے لیے

اک لرزتے ہوئے سبز قطرے کی صورت

کراں تا کراں پھیلے صحرا کی

پتھریلی چُپ کے مقابل

کھڑا کر دیا تھا ؟ ؟

تو پھر اب کیا کریں!

تو پھر اب کیا کریں
کس سمت جائیں
رات کے کڑوے کسیلے جنگلوں میں صبح تک بھٹکیں؟
یا اس صدیوں پُرانے
سنگِ مرمر کے گھِسے زینے پہ
ڈر ڈر کر قدم رکھتے
خود اپنے آپ میں اُتریں؟

تو پھر اب کیا کریں!
آکاش پر تاروں کے کانٹے ہیں
زمیں، کُبڑی غُصیلی جھاڑیوں سے اَٹ چکی ہے
چمکتی تُند آنکھوں سے بھری ہے
دُکھن سی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے!

تو پھر اب کیا کریں !
مُشکیں کسی ہیں
لب سِلے ہیں
اور بُجھی آنکھیں
گڑھوں میں دھنس گئی ہیں
فقط کانوں کے در وا ہیں
دہکتی، ڈستی باتوں کے
سیہ سنپولیے
کانوں میں گھستے جا رہے ہیں
بدن میں زہر سے لبریز شُو کر بھر گئی ہے
نڈر تھی روح لیکن ڈر گئی ہے
تو پھر اب کیا کریں !!

عجب وہ شخص تھا!

عجب وہ شخص تھا
دن بھر خود اپنے تن کے مرقد میں پڑا رہتا
مگر جب رات آتی
آسماں کے پار کوئی روشنی سی جھلملاتی
روشنی کی دُودھیا آنکھیں
فلک کے روزنوں سے جھانکتیں ــــــ تو وہ
اُچک کر، اپنی آنکھوں کے سیہ پَٹ کھول کر
باہر نکل آتا
تھکے ہارے ہوئے گاؤں سے ہٹ کر
لرزتی، جھلملاتی چاندنی کے
طشت میں رُک کر
خود اپنے پاؤں کی ایڑی کو مرکز مان کر
چکّر لگاتا ــــــ گھومنے لگتا
سحر تک گھومتا جاتا

یہی اپنا ٹھکانہ ہے!

ستارہ جیسے آنسو ہے
تری پلکوں پہ آ کر رُک گیا ہے ، تجھ سے کہتا ہے :
یونہی بس دو گھڑی رُک لوں ـــــ تو چلتا ہوں
مجھے بھیگی ہوئی کچھ اور پلکوں پر بھی جانا ہے
مسافر ہوں ، مسافر کا بھلا کوئی ٹھکانہ ہے !

ستارہ اک مسافر ہے
ابھی کچھ دیر وہ مہماں ہے تیرا
پھر اس کے بعد ـــــ کالی رات کی پلکوں پہ چمکے گا
سحر دم ، اوس بن کر پھول کی
آنکھوں میں اُترے گا
پھر اس کے بعد ـــــ جب گہری گھنیری
شام آئے گی

تو وہ بھی ساتھ آئے گا
معاً دیکھے گا مجھ کو
اور پھر یک دَم پَروں کو جوڑ کر
اک تیر کے مانند جھپٹے گا
مری بھیگی ہوئی پلکوں پہ اُترے گا
اُتر کر پَر سمیٹے گا
کہے گا: بس یہی منزل تھی میری
اسی بستی میں آخر ایک دن ہم سب کو آنا ہے
یہی اپنا ٹھکانہ ہے !!

بن باس

وہ ــــــ دو بھائی
ایک ہی جڑ سے انکھوے
بن کر پھوٹے
اک نے پیڑ کا سوانگ رچایا
دوسرا ــــــ تنگ کلادے میں سے
زور لگا کر نکلا ــــــ اور آزاد ہوا
اک اک جنگلی پھول سے اُس نے پیار کیا
کیڑے ، بھونرے
مدھ مکھیوں کے چھتّے
نیلے کچ اکاش کے ساگر میں بہتے
کونجوں کے بجرے
سب کو ــــــ ہاں اُن سب کو اُس نے
اپنا یار بنایا

بادل بھونکے، بجلی کی غرّاہٹ جاگی، تُند ہَوا نے
اپنے آپ سے باہر آکر، پاگل پن میں
ٹکّر مار کے پیڑ گرائے
پَر بکھرائے، پھُولوں کو تاراج کیا
تو ایسے میں بھی، اُس نے اپنے
سب یاروں کا ساتھ دیا

پھر لمحے جاگے
سال بنے
پھر سال اُچھل کر صدیوں میں تبدیل ہوئے
پھر صدیاں اُس کو ساتھ لیے
کیا جانے کن رستوں پہ گئیں
کن ریت بھرے صحراؤں میں روپوش ہوئیں

پر اُس کا جُڑواں بھائی اب تک
گھنی گھنیری چھاؤں اوڑھے
اپنی جڑ سے جُڑا ہوا محبوس کھڑا ہے
اُس کا رستہ دیکھ رہا ہے !!

پرندو!

پرندو!
خاک پر چلتے رہو
چلتے رہو پیہم
لکھو___ لکھتے رہو
پنجوں کے دلکش مُو قلم سے
اک انوکھی داستاں ہر دم
زمیں سے رزق چُننے کے بہانے
بکھیرو ہر طرف قصّے پُرانے
ازل سے تا ابد
لاکھوں کروڑوں "نُور کے سالوں" کی حد تک
رقم کرتے چلو تاریخ ساری
کچھ اپنی، کچھ ہماری
ہے اس خاکداں کی

اور کبھی آکاش کے

ان خوب رُو ٹھنڈے ستاروں کی

لکھو ـــــ لکھتے چلے جاؤ

ہَوا چلنے سے پہلے جس قدر بھی لکھ سکو ـــــ لکھّو

پرندو !

خاک پر چلتے رہو

چلتے رہو ـــــ یوں ہی

لکھو ـــــ لکھتے رہو

لکھتے رہو ـــــ یُوں ہی !!

تم نے دیکھا نہیں ہے وہ منظر!

نہیں! تُم نے دیکھا نہیں ہے وہ منظر
وہ منظر کہ جب چاند
گھِرتا ہے بھاری سیہ بادلوں میں
تو وہ کیسے
گھبرا کے آگے کو بڑھتا ہے
یوں — جیسے اک تیز قینچی
کھُلے گرم کپڑے کے تھانوں
کی گہری تہوں میں
اُترتی چلی جا رہی ہو
مگر ہاتھ
قینچی چلاتا ہوا ہاتھ
نظروں سے اوجھل ہو!

تم کیسے جانو
گھنے گھور جنگل میں وہ خود تو
غائب تھا
لیکن کسی شے کے چلنے
لپکنے کا منظر
مسلسل نظر آرہا تھا
نظر آرہا تھا کہ کیسے درختوں کی بانہیں
کڑکتی تھیں
کیسے سیہ ناگ دو نیم ہو کر درختوں سے گرتے تھے
اور سبز بیلوں کی پتلی، گندھی
پیچ در پیچ آنتوں کے کٹنے کی
آواز آتی تھی
کیسے ــــــ کٹاؤ کی ضربِ مسلسل سے
گہرے، گھنے، سبز جنگل میں
تلوار کی دھار ایسا
منور سا اک راستہ
بن رہا تھا!

نہیں! تم نے دیکھا نہیں ہے وہ منظر

تمہیں تو خبر ہی نہیں ہے کہ مَیں کیسے
اُس تیز تلوار کی دھار ایسے
چمکتے ہوئے راستے پر
رواں تھا
مری انگلیوں میں قلم
سامنے
سبز لفظوں کا جنگل گراں تا گراں تھا
نہیں !
تم نے دیکھا نہیں ہے وہ منظر
مَیں کیسے، تعاقب میں اُس کے
خود اپنے ہی اندر کے جنگل میں
داخل ہُوا
کُنڈ پوکھر میں اُترا
خود اپنے ہی پاتال میں جا گرا
اور میرے عقب میں
گھنے، گہرے جنگل کی باہنوں سے لپٹے
سیہ، شُوکتے
پیچ در پیچ سانپوں نے
اک جال سا

بُن دیا
واپسی کا کوئی اک بھی رستہ نہ رہنے دیا !

مگر وہ چمکتا ہوا اک گنڈا سہ
کہ بجلی کا کوندا تھا
ہر دم مرے سامنے
کوندتا اور لپکتا رہا
اور مَیں ؟
مگر تم نے دیکھا نہیں ہے وہ منظر !!

چوٹ!

ان کو گھر کا نام نہ دینا
گھانس پھونس کے
لکڑی یا اینٹوں کے گھروندے
مَیں گر ان سے ناتہ جوڑوں
یہ بھی مجھ سے ناتہ جوڑیں
ناتہ توڑوں
یہ بھی سارے ناتے توڑیں
یاد کہاں رکھتے ہیں مکیں کو
جانے والے
آنے والے
سب لوگوں سے یہ بیگانے
اپنی ہی خوشبو کے قیدی
اپنی ہی آواز کو جانیں!

میرا گھر تو میرا تن ہے
جنم جنم کے قول نبھائے
جینے مرنے
سپنے تکنے
سپنوں کی ڈوری میں بندھ کر
لمبے اکڑے سفر کرنے کی
ہر بپتا میں
ہر آفت میں
ساتھ مرا وہ دیتا جائے
میرے دُکھ میں اپنا درد ملائے
میرا سارا بوجھ اٹھائے
مَیں جب ٹوٹوں
اس کے اندر بھی جیسے
کوئی چیز
چیخ کر ٹوٹے
اک جھنکار سی آئے
پھر جیسے کوئی اپنے آنسو ضبط کرے
اور ــــــ رُندھی ہوئی آواز میں پوچھے:
چوٹ بہت گہری تو نہیں تھی؟؟

اب اتنی دُور تو مت جاؤ!

نُورانی پیکر تو بہت ہیں
کیا ایسی کوئی ہستی بھی ہے
جس کے سینے کے معبد میں
اک گیلی لکڑی صندل کی
سُلگ رہی ہو؟
خوشبو ہی خوشبو پھیلی ہو؟
شور مچاتی، دل دہلاتی
آگ کی شورکر
گزر چکی ہو
ڈرے ہوئے جسموں کی بھگدڑ
ختم ہوئی ہو
ٹھنڈی میٹھی اک سرگوشی
راکھ ہوئے میدان میں پھرتی

زخموں پر پھاہے رکھتی ہو ؟
بازو سے لٹکی چھاگل سے
سُوکھے ہونٹ ہرے کرتی ہو ؟

اور ہوا میں
اپنے دونوں ہات اُٹھا کر
جانے والوں کے دامن کو پکڑ رہی ہو
اور کہتی ہو :
رُک جاؤ !
اے لوگو ! اک پَل رُک جاؤ
اب اتنی دُور تو مت جاؤ
تم اتنی دُور تو مت جاؤ !!

غزلیں

کھڑکیوں میں جا بجا سوچتے مناظر تھے
آنسوؤں میں تر بتر وہ سفر ہی ایسا تھا

اب تو آرام کریں سوچتی آنکھیں میری
رات کا آخری تارہ بھی ہے جانے والا

بے صدا ، دم بخود فضا سے ڈر
خشک پتّہ ہے تُو ، ہَوا سے ڈر

کورے کاغذ کی سادگی پہ نہ جا
گُنگ لفظوں کی اِس ردا سے ڈر

آسماں سے نہ اِس قدر گھبرا
تُو زمیں کی سزا جزا سے ڈر

جانے کس کھونٹ تجھ کو لے جائیں
شاہ زادے! نقوشِ پا سے ڈر

ترکِ دستِ طلب پہ مت اترا
اپنے دل میں چھُپے گدا سے ڈر

اُس کے ہاتھوں سے بچ سکا ہے کون
خود کو جھُوٹے نہ دے دلاسے، ڈر

ڈر صداؤں سے مت، کہا تھا تجھے
اب تُو اپنی صدائے پا سے ڈر

عرش تک بھی اڑان ہے اپنی
ہم پرندوں کی بددعا سے ڈر

آرزو اک نئے جنم کی نہ کر
اتنی لمبی کڑی سزا سے ڈر

———

دکھ بھری اپنی کہانی جو سُنا دی ہم نے
دیکھ اے شخص! تجھے کیسی سزا دی ہم نے

کیا عجب آئے اِدھر بھی وہ ہَوا کا جھونکا
گھر کی دہلیز پہ اک شمع جلا دی ہم نے

بانسری بول رہی تھی کہ اِدھر آ جاؤ
اُس کی آواز میں آواز ملا دی ہم نے

بات بس یہ تھی کہ ہم پھولوں سے مسمار ہوئے
لے تجھے اتنی سی یہ بات بتا دی ہم نے

ہم نے گر توڑ ہی ڈالے تھے وہ بندھن تو بتا
ہر کڑے وقت میں کیوں تجھ کو صدا دی ہم نے؟

بے خطا ہے تو اُسے کیوں ہے ندامت اتنی
اپنے ہی گھر کو اگر آگ لگا دی ہم نے

دیکھئے ملتی ہے اب اُس کو سزا یا کہ جزا
تیرے انصاف کی زنجیر ہلا دی ہم نے

اب تو یوں لگتا ہے اے گردشِ پیہم جیسے
عمر ساری کسی خیمہ میں بِتا دی ہم نے

سفر تمام ہوا اور جہان باقی ہے
رُکو نہیں کہ ابھی آسمان باقی ہے

چلو مٹا دیے سارے نشانِ پا تُو نے
بیاضِ دل پہ یہ کیسا نشان باقی ہے

کرم کرے نہ کرے اور صدا سُنے نہ سُنے
یقین ختم ہوا، اب گُمان باقی ہے

پہاڑ، ابر، ستارہ، کلی، ہَوا، خوشبو
ہے کون جس کا یہ طرزِ بیان باقی ہے

مرے بدن میں کہیں ہے ابھی تری خوشبو
مکاں کے ساتھ ابھی لامکان باقی ہے

سخن کے ٹوٹ چکے اُس سے سلسلے سارے
بس ایک رنجشِ لب، درمیان باقی ہے

نہ چھت رہی ہے نہ چھتنار پھر بھی کہتے ہو
فلک کا سر پہ ابھی سائبان باقی ہے

ابھی سے جانے لگے ہو ذرا ٹھہر جاؤ
ابھی پہاڑ سی یہ داستان باقی ہے

تکان نام اسی کیفیت کا ہے شاید
لہو بدن میں نہیں اور جان باقی ہے

لُٹا کر ہم نے پتّوں کے خزانے
ہواؤں سے سُنے قصّے پُرانے

کھلونے برف کے کیوں بن گئے ہیں
تمہاری آنکھ میں اشکوں کے دانے

چلو اچھا ہُوا بادل تو برسا
جلایا تھا بہت اُس بے وفا نے

یہ میری سوچتی آنکھیں کہ جن میں
گزرتے ہی نہیں گزرے زمانے

ہَوا کے ساتھ نکلوں گا سفر کو
جو دی مہلت مجھے میرے خُدا نے

بتا کس نے کیا پاگل گلی کو
سُلگتی شاخِ صندل نے؟ حِنا نے؟

سرِ مژگاں وہ دیکھو جل اُٹھے ہیں
دیے جتنے بجُھائے تھے ہَوا نے

اس گریۂ پیہم کی اذیت سے بچا دے
آوازِ جرس! اب کے برس مجھ کو ہنسا دے

یا ابرِ کرم بن کے برس خشک زمیں پر
یا پیاس کے صحرا میں مجھے جینا سکھا دے

مَیں بھی تری خوشبو ہوں مری سمت بھی تُو دیکھ
مہلت تجھے گر سلسلۂ موجِ صبا دے

سُورج نے مجھے برف کیا ہے تو تجھے کیا
کیا تجھ کو اگر برف مجھے آگ لگا دے

ایسا بھی نہیں ہے کہ فقط خاک نشیں ہوں
آجائے ہَوا آ کے مری خاک اڑا دے

خوشبو کی طرح دربدری خُو ہو مری گر
بے شک تو مجھے میری نگاہوں میں گرا دے

کانٹے کی جراحت سے بھی مر جاتے ہیں کچھ لوگ
رکھ حوصلہ، اتنی بھی نہ اب خود کو سزا دے

یا ربّ! تیری رحمت کا طلب گار ہے یہ بھی
تھوڑی سی مرے شہر کو بھی آب و ہَوا دے

کیا تیرا بگڑتا ہے اگر چاندنی شب تُو
اک بار مجھے پھر میری آواز سُنا دے

گُل نے خوشبو کو تج دیا نہ رہا[1]
خود سے خود کو کیا جُدا نہ رہا

رات دیکھے سفر کے خواب بہت
پَو پھٹی جب تو حوصلہ نہ رہا

قافلہ اُس کے دم قدم سے تھا
چل دیا وہ تو قافلہ نہ رہا

---

[1] مشتاق قمر کی یاد میں

ربط اُس کا زماں سے کیا رہتا
جب زمیں ہی سے سلسلہ نہ رہا

ترک کر خامشی کا مسلک ، سُن
ہو گیا جو بھی بے صدا نہ رہا

عُمر بھر اس نے بے وفائی کی
عُمر سے بھی وہ باوفا نہ رہا

آنکھ کھولی تو دُوریاں تھیں بہت
آنکھ میچی تو فاصلہ نہ رہا

کس کی خوشبو نے بھر دیا تھا اُسے
اُس کے اندر کوئی خلا نہ رہا

خود سے ہُوا جُدا تو ملا مرتبہ تجھے
آزاد ہو کے مجھ سے مگر کیا ملا تجھے

اک لحظہ اپنی آنکھ میں تُو جھانک لے اگر
آؤں نظر میں بکھرا ہُوا جا بجا تجھے

تھا مجھ کو تیرا [illegible] ہُوا پھُول ہی بہت
لفظوں کا اہتمام بھی کرنا پڑا تجھے

یہ اور بات مَیں نے صدائیں ہزار دیں
آئی نہ دشتِ ہول سے اک بھی صدا تجھے

تُو نے بھی خود کو مرکزِ عالم سمجھ لیا
لگ ہی گئی زمانے کی آخر ہَوا تجھے

کیا قہر ہے کہ رنگوں کے اس ازدحام میں
جُز رنگِ زرد اور نہ کچھ بھی ملا تجھے

[illegible]وں نے تار تار کیا آسماں تمام
[illegible]نا راس تاروں بھری یہ ردا تجھے

[illegible]م رہے سفر میں ترا ناقۂ خیال
دیتا رہوں مَیں روز یہی بددُعا تجھے

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عُمر ہی چلنا پڑا تجھے